ISSN 1992-5018

ISLAMABAD LAW REVIEW

Quarterly Research Journal of Faculty of Shariah& Law, International Islamic University, Islamabad

Volume 3, Number 1&2, Spring/Summer 2019

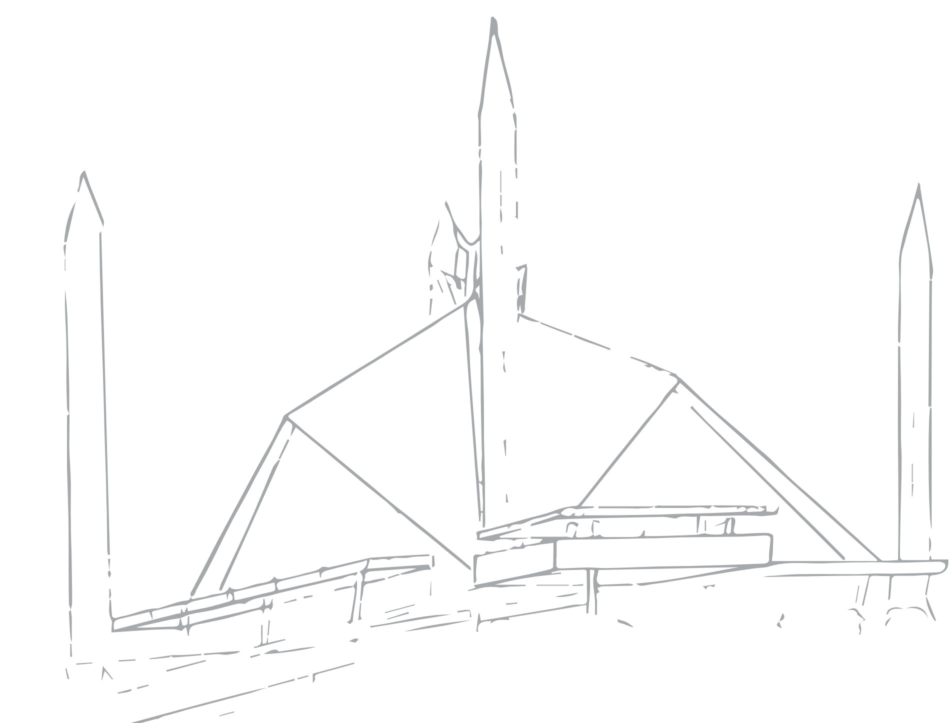

وراثت کے قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے میں اسلامی نظریاتی کونسل کے کردار کا تنقیدی جائزہ: یتیم پوتے/پوتی کی وراثت کے حوالے سے خصوصی مطالعہ

نبیلہ فلک*

Abstract

Pakistan is an ideological state created in the name of Islam. Muslims of India needed a place where they could do practice Islamic laws and principles freely. The Islamization of laws in Pakistan started after 1960. Many Islamic institutions were created for this purpose: the council of Islamic Ideology is one of them. The Council was established in 1962, under the government of Ayub Khan, designated as Islamic Advisory Council. It was re-designated in 1973 as Council of Islamic Ideology. The Council is a constitutional body of Pakistan that advises the legislature whether or not a certain law is repugnant to Islam; namely, the Qur'ān *and the* Sunnah *and responsible for giving legal advice to the Parliament in this regard. This paper analyses the role of the Council for Islamization of law of Inheritance. Meanwhile, special focus will be on the issue of inheritance of an Orphan (grandson/ daughter) and the opinion of the Council.*

Keywords: *role, Council of Islamic Ideology. Islamization, inheritance, Orphan, grandson.*

اسلامی نظریاتی کونسل کا تعارف و مقاصد

پاکستان کے پہلے آئین (۱۹۵٦ء) میں قرار دادِ مقاصد کی روشنی میں دفعہ ۱۹۸ (ا) میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ کوئی بھی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو قرآنِ پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام کے منافی ہو، نیز موجودہ قوانین کو بھی ان احکام کے مطابق بنایا جائے۔[1] اس دفعہ کے

* اسسٹنٹ پروفیسر اسلامیات یونی ورسٹی آف لاہور، سرگودھا کیمپس۔
nabeela.falak@gmail.com

(1)۔ آئین پاکستان ۱۹۷۳ء، دفعہ ۲ (۱)۔

دوسرے حصے میں اس کو عملی طور پر بروئے کار لانے کے لیے اس دفعہ کی ذیل شق (۳) میں یہ قرار دیا گیا کہ صدر پاکستان اس آئین کے نفاذ کے دن سے ایک سال کے اندر اندر ایک کمیشن قائم کریں گے جس کا بنیادی مقصد یہ ہو گا کہ وہ موجودہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق بنانے کے لیے ضروری سفارشات پیش کرے گا۔ کمیشن اس بارے میں بھی سفارشات پیش کرے گا کہ وہ کون سے مراحل ہیں جن میں قوانین کی اسلامی تشکیل کے لیے کیے جانے والے اقدامات نافذ العمل ہو سکیں گے۔ اس کمیشن کے ذمے دوسرا اہم کام یہ تھا کہ وہ قومی اور صوبائی قانون ساز مجالس کی رہنمائی کی غرض سے اسلامی احکام کو ایسی موزوں شکل میں مدون کرے جس کے ذریعے انہیں قانونی شکل دی جا سکے۔

۱۹۶۲ء میں جب نیا آئین بنا تو اس میں بھی دفعہ ۱۹۹ کے تحت ایک مشاورتی کونسل کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا۔ اس دفعہ میں اسے ''اسلامی نظریے کی مشاورتی کونسل'' کا نام دیا گیا آئین کی دفعہ ۲۰۴ (۱) کے مطابق ''کونسل'' مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کو ایسی سفارشات پیش کرے گی جن کے ذریعے پاکستان کے مسلمان اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی اسلامی احکام کے مطابق ڈھالنے کے قابل ہو سکیں۔ نیز اس کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ کونسل کو یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی کہ وہ تمام مروجہ قوانین کا اس لحاظ سے جائزہ لے کہ انہیں قرآن پاک اور سنت رسول ﷺ میں منضبط اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق بنایا جا سکے۔

صدر ایوب خان کے دور کے آئین کے مطابق یکم اگست ۱۹۶۳ء کو ''اسلامی مشاورتی کونسل'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس کونسل کے پہلے صدر جسٹس ابو صالح محمد اکرم تھے۔ ان کے بعد علامہ علاؤ الدین صدیقی، جسٹس حمود الرحمٰن، جسٹس محمد افضل چیمہ اور جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب یکے بعد دیگرے اس کے چیئرمین نامزد کئے گئے۔ ۱۹۷۳ء کے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے آئین کے تحت اس کونسل کا نام ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کر دیا گیا جس کے صدر ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ مقرر ہوئے تھے۔ اس کونسل (یا کونسلوں) کے اغراض و مقاصد میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ''وہ حکومت کو ان اسلامی امور سے متعلق مشورہ دے گی یا راہنمائی کرے گی جو حکومت کی طرف سے پوچھے جائیں گئے۔''(2)

(2)– محمد احمد منیر، ''اسلامی نظریاتی کونسل، تشکیل، اسلوب اور اہم فقہی آراء''، مشمولہ: **اجتماعی اجتہاد تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں** (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۰۷، مرتبہ محمد طاہر منصوری، اسلام)، ص ۲۷۰۔

۱۹۶۲ءکے آئین کے تحت ''اسلامی نظریے کی مشاورتی کونسل'' پہلی مرتبہ وجود میں آئی۔ یکم اگست ۱۹۶۲ء کو سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج جناب جسٹس ابو صالح محمد اکرم کو اس کا پہلا چیئرمین مقرر کیا گیا اور ''کونسل'' نے اپنے کام کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۶۲ء کو وزارتِ خزانہ حکومت پاکستان کی جانب سے سود کی حرمت اور اس کے متبادل نظام سے متعلق پہلا استفسار کیا گیا۔ یہ ''کونسل'' ۱۹۷۳ء تک اپنے فرائض منصبی انجام دیتی رہی۔

پاکستان کی آئینی تاریخ میں ۱۹۷۳ء میں ایک نیا باب رقم ہوا جب آئین (۱۹۷۳ء) میں اسلام کو ریاست پاکستان کا دین (State Religion of Pakistan) قرار دیتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی گئی کہ تمام موجودہ قوانین کو قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا اور آئندہ کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو اسلامی حکام کے منافی ہو۔ نئے آئین کی دفعہ ۲۲۸ میں ''اسلامی نظریے کی مشاورتی کونسل'' کی جگہ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کو لازمی قرار دیا گیا تاکہ وہ قوانین کی اسلامی تشکیل اور آئندہ کی قانون سازی کو اسلامی ضابطوں کے مطابق بنانے میں مدد و معاون ہو۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت جب کونسل از سر نو تشکیل دی گئی تو اس کو زیادہ فعال بنایا گیا۔ جسٹس حمودالرحمن کو اس کا پہلا چیئرمین مقرر کیا گیا۔[3]

اسلامی نظریاتی کونسل کی ہیئت ترکیبی

۱۹۷۳ءکے آئین کی دفعہ ۲۲۸ کی ذیلی شق ۲ میں اس کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ کونسل کم از کم آٹھ اور زیادہ سے سے زیادہ بیس ایسے ارکان پر مشتمل ہو گی جنہیں صدر مملکت ان اشخاص میں سے مقرر کریں گے جو اسلام کے اصولوں اور فلسفے کا، جس طرح کہ قرآن پاک اور سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے، علم رکھتے ہوں یا جنہیں پاکستان کے اقتصادی، سیاسی، قانونی اور انتظامی مسائل کا فہم وادراک حاصل ہو۔ دفعہ ۲۲۸ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان اور ان کے ساتھ کم از کم دو ارکان سپریم کورٹ یا کسی ہائی کورٹ کے حاضر سروس یا سابق جج بھی نامزد کیے جائیں۔

جج صاحبان کی بطور رکن نامزدگی میں یہ حکمت کارفرما تھی کہ علوم دینیہ اور فقہ میں تخصص رکھنے والے افراد کی اسلامی قانون سازی کے ضمن میں مفید معاونت کر سکیں گے۔ مسائل کے حل کے لیے اجتماعی کوششوں میں امام غزالیؒ نے ''تجزی اجتہاد'' کے اصول کا جو ذکر فرمایا ہے علما اور

(3)۔ ایضاً۔

قانونی ماہرین کا اسلامی نظریاتی کونسل میں اکٹھا ہونا اسی اصول کی ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔[4] کونسل میں ایک خاتون رکن کا تقرر بھی ضروری قرار دیا گیا تاکہ خواتین سے متعلق مسائل پر بحث کے دوران ایک اہل علم خاتون ان کی نمائندگی کر سکے۔ کونسل کے انہی اراکین میں سے کسی ایک کو صدر پاکستان چیئرمین مقرر کر سکتا ہے۔ چیئرمین کونسل کی معیاد تین سال ہے جسے مزید تین سال کے لیے بڑھایا جا سکتا ہے اور اراکین اور چیئرمین کا از سر نو تعین کیا جا سکتا ہے۔ قوانین کی اسلامی تشکیل، نئے قوانین کو اسلامی ضابطوں کے مطابق بنانے اور پیش آمدہ مسائل کا قرآن و سنت کی روشنی میں حل پیش کرنے کے لیے قائم کی جانے والی اسلامی نظریاتی کونسل ایک بااختیار آئینی ادارہ ہے جو ایک مؤثر اور فعال انداز میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں مصروف ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل اور اجتہاد

کونسل کی ساخت میں ارکان کی فقہی صلاحیت کو نمایاں مقام دیا گیا ہے اور ان کے لیے قرآن و سنت اور دینی علوم سے گہری واقفیت کو ایک لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ تاہم علما کے علاوہ جج حضرات اور قانونی ماہرین بھی اس کے ارکان ہوتے ہیں۔ کونسل میں پاکستان کے تمام معروف مکاتب فکر یعنی دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ کو نمائندگی دی جاتی ہے تاکہ مسلکی توازن و اعتدال کی فضا برقرار رہے۔ مسلکی معیار انتخاب کی بنا پر انہی حلقوں میں کونسل کی اجتہادی حیثیت غور طلب مسئلہ ہے؛ کیونکہ مسالک کی بنا پر منتخب ہونے والے بعض ارکان فقہی رائے دیتے ہوئے عموماً اپنے مسلک کی تشریح و تعبیر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، جن سے کونسل کی رائے کی ثقاہت متاثر ہو سکتی ہے۔ اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ مجتہد اپنی مسلکی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر فقہی رائے دے۔ ایک مجتہد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تمام فقہا کی آرا اور نقطہ نظر سے واقف ہو، تاکہ زیر بحث مسئلے میں ان سے استفادہ کر سکے، یا ان کی آرا میں سے وہ آرا منتخب کر سکے جو دلائل کی بنیاد پر زیادہ قوی ہوں اور لوگوں کے مفاد و مصلحت کی اس میں زیادہ رعایت ہو۔ اگر مجتہد ایک متعین مکتب فکر کے اندر رہ کر مسائل کا حل تلاش کرے گا تو اس کی رائے کی ثقاہت متاثر ہو سکتی ہے۔ مزید برآں مسلکی وابستگی کی بنا پر علما کے انتخاب نے اصل اہلیت اور کونسل کے تقاضوں کو پس پشت ڈال دیا ہے اور ماضی میں بعض اوقات ایسے افراد پر نگاہِ انتخاب پڑی ہے جو فقہی و قانونی مہارت کی بجائے سیاسی وابستگیوں کی بدولت

(4)– غزالی محمد بن محمد، **المستصفی من علم الأصول**، (کراچی: ادارہ القرآن والعلوم الاسلامیہ، ۱۹۸۷)، ۲: ۳۸۳۔

نمایاں تھے۔ البتہ حالیہ ادوار میں کونسل تمام مکاتب فکر اور عالم اسلام کے تمام فقہا کی رائے کو مکمل اہمیت دیتے ہوئے مسائل کے استنباط کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس طرح کے تمام تحفظات کے باوجود اسلامی نظریاتی کونسل اجتماعی اجتہاد کا ایک بہترین اور مؤثر ادارہ ہے۔ کونسل کی سفارشات پر پاکستان میں میں بعض ایسے قوانین کا نفاذ ہو جو اس ریاست کی نظریاتی سمت متعین کرنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کونسل کی آرا کی ثقاہت اور استنادی حیثیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان سفارشات کو نہ صرف اندرونِ ملک سراہا گیا، بلکہ عالم اسلام میں بھی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ (5)

کونسل کا اجتہادی اسلوب، اصول اور طریقِ کار

مجلس شوریٰ کے کسی ایوان، کسی صوبائی اسمبلی، صدر یا کسی گورنر کی طرف سے جب کسی مسئلے یا قانون کی بابت شرعی رائے معلوم کرنے کے لیے اسے اسلامی نظریاتی کونسل کو بھیجا جاتا ہے تو اس سے پہلے کونسل اس استفسار کی پوری تفصیل تمام اراکین کو ارسال کر دیتی ہے۔ اور ان سے یہ گزارش کرتی ہے کہ تمام فاضل اراکین مذکورہ مسئلے سے متعلق اپنی انفرادی تحقیق کے ذریعے شرعی رائے مرتب کریں۔ یہ انفرادی آرا موصول ہونے پر انہی تمام اراکین کو ارسال کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کونسل متعلقہ مسئلے پر اجتماعی غور وخوض کرنے کے لیے اپنا باقاعدہ اجلاس طلب کرتی ہے جس میں تمام اراکین شامل ہوتے ہیں۔ وہ مسئلہ اگر کسی خاص فن سے متعلق ہو تو اس فن کے بعض معروف ماہرین کو بھی اجلاس میں خصوصی طور پر دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ صورت مسئلہ کو اراکین کے سامنے مزید بصیرت کے ساتھ واضح کریں۔ مثلاً طب سے متعلق قوانین پر رائے دیتے ہوئے یا نئے قوانین وضع کرتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل اطبا کو خصوصی دعوت دیتی ہے کہ وہ طبّی نقطہ نظر کی وضاحت کریں۔ اس طرح معیشت سے متعلق قوانین کے لیے ماہرین معیشت کی ہر ممکن مدد حاصل کی جاتی ہے۔ (6)

اسلامی نظام بیمہ وضع کرتے ہوئے کونسل نے پاکستان کے تقریباً تمام معروف بیمہ کمپنیوں کے سربراہوں کو اس گروپ کا حصہ بنایا تھا جس نے وہ نظام وضع کیا۔ اس کے بعد اجلاس میں اس

(5)۔ **اجتماعی اجتہاد**، ص ۲۷۲۔
(6)۔ **اجتماعی اجتہاد**، ص ۲۷۵۔

مسئلے کے تمام پہلوؤں کا شرعی اور عملی نقطہ نظر سے تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔اس معاملے میں اگر ماضی کے فقہاے کرام کی آرا موجود ہوں تو انہیں بھی موجودہ حالات میں قابل عمل ہونے کے اعتبار سے دیکھا جاتا ہے اگر قرآن وسنت میں واضح حکم موجود ہو تو پھر کسی دوسرے ذریعے کو اختیار نہیں کیا جاتا، بلکہ قرآن وسنت کے اس واضح موقف کو اختیار کرتے ہوئے کونسل اپنی اجتماعی رائے مرتب کر لیتی ہے۔ اگر قرآن وسنت سے واضح حکم نہ ملے تو اجماع صحابہؓ اور اجماع امت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ ان میں بھی اس مسئلے کا واضح حل نہ ملنے کی صورت میں فقہاے کرام کی آرا کو سامنے رکھتے ہوئے حالات و زمانہ کی رعایت اور دین میں آسانی کے اصول کے پیش نظر اس مسئلے پر اجتہاد کے ذریعے اجماعی شرعی رائے مرتب کی جاتی ہے۔اس ضمن میں دوسرے ممالک کے علماوفقہا سے بھی بعض اوقات رائے لی جاتی ہے۔ مثلاً حدود و قوانین مرتب کرتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل نے شام اور سوڈان کے بعض معروف اہل علم سے بھی رائے لی تھی۔

کونسل کے اجلاسوں کے دوران میں جتنی بھی فقہی آرا مرتب کی جاتی ہیں وہ کونسل کی حد تک اجماعی حیثیت رکھتی ہیں۔ البتہ اگر حتمی رائے مرتب کرتے وقت کوئی رکن اس رائے سے اختلاف کرے تو اسے من و عن اختلافی رائے کے طور پر نقل کر دیا جاتا ہے۔ موجودہ قوانین کی بابت جب استفسار کیا جاتا ہے تو کونسل اگر اس قانون کو خلاف شریعت پائے تو شرعی نقطہ نظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس قانون کا متبادل قانون بھی مرتب کر دیتی ہے۔ اگر اس قانون میں صرف ترمیم کی ضرورت ہو تو اس ترمیم کے ساتھ اس قانون کو بیان کر دیتی ہے کہ اس کے الفاظ اس طرح ہونا چاہئیں۔ آخر میں اس رائے کو سفارشات کی شکل میں مکمل تفصیل کے ساتھ استفسار کنندہ ہیئت یا ادارے کو بھیج دیا جاتا ہے۔[7]

کونسل کے فقہی واجتہادی کام کا جائزہ

کونسل نے اپنی تاسیس سے لے کر آج تک کم و بیش ۱۵۷ اجلاس منعقد کئے ہیں۔ان اجلاسوں میں مختلف نوعیت کے اہم مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ جن پر کونسل نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ کونسل نے مفوضہ ذمہ داریوں کے اعتبار سے اپنے کام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔[8] پہلا کونسل

(7)– ایضا:۲۷۶۔

(8)– ایضا۔

کے ذمے یہ کام تھا کہ اگست ۱۹۴۷ء کو برطانوی استعمار سے ورثے میں ملنے والے تمام قوانین، قواعد و ضوابط اور اس کے بعد پاکستان کے وفاقی و صوبائی قانون ساز اداروں کے واضح کردہ قوانین واحکام کا اسلامی نقطہ نظر سے تفصیلی جائزہ لیں اور قوانین کے ایسے حصوں کی نشاندہی کرے جو قرآن و سنت سے متصادم ہوں۔ کونسل کے ذمے دوسرا کام یہ ہے کہ اسلامی احکام کو موزوں شکل میں مدون کر کے مجلس شوریٰ، یعنی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو پیش کرے تاکہ انہیں قانون سازی کے ذریعے نافذ کیا جاسکے۔

موجودہ ملکی قوانین کا شرعی جائزہ

آئین کی دفعہ ۲۳۰ کی ذیلی شق (۴) کے مطابق کونسل کو پہلے سے موجود قوانین کے ایک مبسوط جائزے پر جو رپوٹ پیش کرنا تھی، وہ بعض ناگزیر وجوہات کی بناپر بروقت پیش نہ ہوسکی۔ البتہ جو انہیں سابقہ قوانین کے جائزے کے لیے کونسل نے اپنے قیام سے لے کر دسمبر ۱۹۹۴ء تک متعدد اجلاسوں میں قوانین کی ایک ایک شق کو زیر غور لاکر انہیں قرآن و سنت کے مطابق ڈھالا اور قانون سازی کے لیے قانون ساز اسمبلیوں کو پیش کیا۔ یہ قوانین وہ تھے جو قیام پاکستان کے وقت برطانوی حکومت سے بطور ورثہ ملے تھے یا وقتاً فوقتاً ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء تک قانون ساز اداروں نے بنائے تھے، یا ان قوانین میں ترمیم کی گئی تھیں۔ ان قوانین میں سے کونسل نے جن میں ترامیم تجویز کیں ان میں سے اہم یہ ہیں:

- جدید بینکاری اور ربا کے قوانین
- قوانین شہادت
- مجموعہ تعزیرات پاکستان
- قانون انتقال جائیداد
- قانون معاہدہ مسلم عائلی قوانین
- قانون ضابطہ فوجداری
- قانون وراثت، قانون بیع مال
- قانون محصولات
- قوانین بیمہ
- قانون پنشن و گریجویٹی

- قانون معاوضہ محنت کشاں
- قانون اسناد طبّی
- آئین پاکستان۔۱۹۷۳ء[9]

۱۹۷۳ء تک قوانین کا جائزہ لینے کا اختیار تو کونسل کو آئین کی رو سے دیا گیا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ۱۹۷۳ء کے بعد بنائے گئے ایسے قوانین جو کونسل کی رائے لیے بغیر بنائے گئے ہیں، ان کا جائزہ لینا بھی کونسل کے دائرہ اختیار میں ہے یا نہیں؟ ۱۹۹۰ء میں کونسل نے اس امر کا سنجیدگی سے جائزہ لیتے ہوئے آئین کی وہ دفعات جن میں اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل اور اس کی ذمہ داریوں کا ذکر موجود ہے، کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ:

"قانون سازی ایک مسلسل عمل ہے اور ازروئے دستور ایک معینہ مدت کے لیے منتخب ہونے والے قانون ساز اداروں کی بنیادی آئینی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی احکام کی روشنی میں قوانین وضع کریں۔ آئین کا تقاضا ہے کہ مستقبل میں جو بھی قانون بنایا جائے، وہ اسلامی احکام کے مطابق ہو (دفعہ ۲۲۸) لہٰذا اسلامی نظریاتی کونسل کو ہر قانون پر جو وضع کیا جائے گا، اور ہر قانونی دستاویز پر جو وجود میں آئے گی، برابر نظر رکھنا ہو گی۔ اور اس کا اسلامی احکام کی روشنی میں جائزہ لینا ہو گا۔ اسی طرح خود آئین کے اندر ہی ہر قانون یا قانونی دستاویز کو اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول بنانے کا منہج اور لائحہ عمل تجویز کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا کونسل کے آئینی فرائض میں داخل ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کے بعد وضع ہونے والے قوانین کا بھی اسلامی احکام کی روشنی میں مسلسل جائزہ لیتی رہے۔"[10]

کونسل نے ان تمام وفاقی و صوبائی قوانین کا بشمول مارشل لا کے احکام وضوابط، قواعد وضوابط، ضمنی قوانین، احکام اعلامیات اور دیگر قانونی دستاویزات جو ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کے بعد منظر عام پر آئیں، کا جائزہ لیا اور ان میں مناسب ترامیم تجویز کیں۔

پاکستان میں اسلامی قوانین کو غالب و بالادست بنانے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل نے گراں قدر کوششیں کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے قوانین میں جہاں بھی ہمیں اسلامی رنگ نظر آتا ہے، اس میں کونسل کی کاوشوں کا حصہ قابل لحاظ ہے۔ قیام پاکستان سے ۱۹۷۹ء تک کے عرصے میں

(9)– فائنل رپورٹ، **جائزہ قوانین، ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء تک** (اسلام آباد: اسلامی نظریاتی کونسل، مئی ۲۰۰۲)، ص ۳۳۵-۳۴۱۔

(10)– دیکھیے: **قوانین کی اسلامی تشکیل: سلسلہ دوم** (اسلام آباد: اسلامی نظریاتی کونسل، مئی ۲۰۰۱ء ص ۶۔

قوانینِ اسلام کے نفاذ کے ضمن میں کوئی بڑی پیش رفت نہ ہو سکی۔ لیکن اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں حدود آرڈیننس کے نفاذ سے شروع ہونے والے سلسلے میں متعدد قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنایا گیا۔ مثلاًز کوۃ و عشر کا نظام، ملک سے سود کے خاتمے کے لیے حکومت کے احکامات، قصاص ودیت آرڈیننس، قانون عدلیہ اور اقتصاد کے اسلامی نظام کے لیے کارکن تیار کرنے کی خاطر پہلے شریعہ فیکلٹی اور پھر اسلامی یونیورسٹی کا قیام، عدلیہ کو قوانین کے اسلامیانے کا اختیار دینے، شریعت بینچوں اور پھر وفاقی شرعی عدالت کا قیام جیسے اہم اقدامات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دفاتر میں نماز ظہر کا اہتمام، ماہِ رمضان کے احترام میں سینماہالوں کی تالہ بندی، عورتوں کے لیے علیحدہ یونیورسٹیوں کا قیام، پاکستان میں گریجویشن کی سطح تک اسلامیات کی بطور لازمی مضمون شمولیت، محتسب اعلیٰ کے منصب کا اجرا، ذرائع ابلاغ پر فحش پروگراموں پر مکمل پابندی بھی اسلامی نظریاتی کونسل کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔(11)

اسلامی نظریاتی کونسل نے دوسرے قوانین کی طرح مسلم عائلی قوانین پر بھی غور وفکر کر کے اس میں خلافِ اسلام دفعات کو حذف یا تبدیل کرنے کی سفارشات دی ہیں۔ اس ضمن میں پاکستان میں رائج مسلم عائلی قوانین آرڈیننس ۱۹۶۱ء کا دفعہ وار جائزہ لے کر اس میں ترمیم کی تجویز کی گئی ہیں۔ جن موضوعات کو بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے، وراثت کے قوانین ان میں سے اہم ہیں۔ یتیم پوتے و پوتی کی وراثت کا مسئلہ بھی اُس میں شامل ہے۔

وراثت کے قوانین

پاکستان میں رائج قانون وراثت کے بارے میں کئی ابہامات پائے جاتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک طویل عرصے تک پاکستان بننے سے پہلے اور بعد میں بھی اکثریتی علاقوں اور خاندانوں میں جانشینی اور وراثت مسلم قانون کے تحت نہیں بلکہ رواجی قانون کے تحت تقسیم ہوتی تھی اور اس بارے میں کوئی یکساں قانون نہیں تھا۔ ۱۹۳۵ء میں صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) میں شریعت کے قانون کا اطلاق ہوا لیکن اس کے ساتھ ساتھ رواجی قانون بھی برقرار رہا۔ پاکستان بننے کے بعد ابتدائی سالوں میں صوبوں نے شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء میں ترامیم کے ذریعے عورتوں کو

(11)۔ **اجتماعی اجتہاد**، ص ۲۹۱۔

وراثت میں زرعی زمین حاصل کرنے کا حق دیا لیکن پھر بھی بہت سے معاہدات میں رواجی قانون ختم نہ ہوا۔

۱۹۶۳ء کے مسلم شخصی شریعت ایکٹ نے مسلمانوں کے لیے بہت سے معاملات بشمول وراثت میں مسلم قانون کا نفاذ کیا۔ اس قانون نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۵ء کے شریعت ایکٹ کو منسوخ کر دیا جس کے بعد نئے قانون کا نفاذ ہوا۔ ۱۹۶۲ء کے قانون کے نفاذ کے بعد بھی وراثت کے حوالے سے رواجی قانون کی صورتحال یکسر تبدیل نہ ہوئی؛ کیونکہ ۱۸۷۲ء کا پنجاب لا ایکٹ نافذ تھا جس کی دفعہ پانچ کے تحت وراثت کے حوالے سے ان خاندانوں میں جہاں رواج کا سلسلہ چلا آرہا تھا۔ ان کے لیے وراثت و جانشینی میں ایک حد تک رواج کا اطلاق رہا۔ لیکن ۱۹۸۳ء میں سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بینچ نے پنجاب لاز ایکٹ کی دفعہ پانچ کو کالعدم قرار دے دیا۔[12] پاکستان میں آبادی کی اکثریت سنی اور حنفی فقہ کی پیروکار ہے؛ اس لیے پاکستانی قانونِ وراثت میں حنفی فقہ کی پیروی کی جاتی ہے۔ پاکستان میں شیعوں پر شیعہ قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ پاکستان کے قانونِ وراثت میں مرد و خواتین کی وراثت کے حقوق کے بارے میں انہی بنیادی اصول کی تقلید کی گئی ہے، جو شریعت نے بیان کئے ہیں۔ البتہ یتیم پوتے اور پوتی کے حق وراثت کے حوالے سے مسلم عائلی قوانین ۱۹۶۱ء میں ترمیم کی گئی تھی۔

یتیم پوتے و پوتی کی وراثت

مسلم عائلی قوانین آرڈیننس کی دفعہ ۴ کی رو سے مورث کے کسی لڑکے کی موت واقع ہو جائے تو ایسے لڑکے یا لڑکی کے بچوں کو وراثت میں وہی حصہ ملے گا جو ان کے والد کے زندہ ہونے کی صورت میں ملنا تھا۔ اس طرح مذکورہ قانون کی رو سے یتیم پوتے کو اپنے والد کی وفات میں کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑتا۔ یہ قانون احکام شریعت سے متصادم ہے۔ شریعت میں چچا یا تایا کی موجودگی میں پوتوں کو دادا کی وراثت میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ سوائے اس کے کہ دادا نے اپنی زندگی میں کوئی چیز انہیں ہبہ کر دی ہو۔ یا ان کے حق میں اپنے طور کوئی وصیت کر دی ہو، بشرطے کہ وہ کل جائیداد کے ایک تہائی سے زائد نہ ہو۔[13]

---

(12)۔ دیکھیے: PLS 1983 S.C. 273 اور PLD 1984 S.C. 943۔

(13)۔ دیکھیے: محمد محی الدین عبد الحمید، **أحكام المواريث** (مصر: مطبعہ عیسی البابی، ۱۹۴۷)، ص، ۱۲۔

صحیح بخاری کی روایت ہے:

ولد الأبنا بمنزلة الولد إذا لم يكن دونهم ولد ذكر، ذكرهم كذكرهم، وأنثاهم كأنثاهم، يرثون كما يرثون، و يحجبون كما يحجبون، ولا يرث ولد الابن مع الابن.[14]

[میت کے پوتے بیٹوں کی غیر موجودگی میں بیٹوں کے مرتبے میں ہوں گے۔ ان کی اولاد کے مذکر اصل اولاد کے مذکر کی طرح ہوں گے اور ان کی عورتیں صلبی اولاد کی عورتوں کے مرتبے میں ہوں گی۔ جس طرح وہ وارث تھے، یہ وارث ہوں گے اور جس طرح وہ حاجب یا محجوب ہو سکتے ہیں یہ بھی اسی طرح حاجب یا محجوب ہوں گے اور پوتا بیٹے کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔]

اسلامی قانون کے مطابق اگر کوئی مرحوم اپنا بیٹا اور پہلے سے مرنے والے بیٹے کی اولاد پیچھے چھوڑتا ہے تو یہ یتیم پوتے پوتیاں وراثت سے محروم رہیں گے۔ پوتی کو ان حالات میں بعض اوقات حصہ ملتا ہے اور بعض حالات میں نہیں ملتا۔[15] جب کہ مسلم عائلی قوانین ۱۹۶۱ء کے لیے اس آرڈی نینس کی دفعہ نمبر ۴ میں یتیم پوتے کی وراثت کا قانون حسبِ ذیل الفاظ میں بیان ہوا ہے:۔

"4. Succession. In the event of the death of any son or daughter of the *propositus* before the opening of succession, the children of such son or daughter ,if any, living at the time the succession opens, shall *per stripes* receive a share equivalent to the share which such son or daughter as the case maybe , would have received, if alive."[16]

[کہ مورث اعلیٰ کی جانشینی کے فیصلے سے پہلے اگر اس کی کوئی بیٹی یا بیٹا مر جائے تو اس پہلے مرنے والے بیٹے یا بیٹی کی اولاد اگر ہو اور وہ جانشینی کے فیصلے کے وقت زندہ ہو تو وہ حصہ ملے گا جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو ملتا اگر وہ زندہ ہوتے۔]

مثلاً مسلم فیملی لاز آرڈی نینس ۱۹۶۱ء کی رُو سے اگر کوئی شخص مر جائے اور وہ اپنے پیچھے ایک بیٹی اور ایک پوتی چھوڑ جائے تو بیٹی کو ۳/۱ اور پوتی کو ۳/۲ ملے گا۔)۴۸(جب کہ فقہ حنفی کے مطابق بیٹی کو

(14)– محمد بن اسماعیل البخاری، **الجامع الصحيح**، کتاب الفرائض: باب ميراث ابن الابن إذا لم يكن ابن۔

(15)– سراج الدین محمد بن عبدالرشید السجاوندی، **السراجي في الميراث** (کراچی: مکتبۃ البشریٰ، ۲۰۱۱)، ص ۲۰۔

(16)– Section 4, Muslim Family law ordinance.

۱/۲ ملے گا اور پوتی کو ۱/٦ ملے گا۔ اس کی دلیل میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے بیٹی، پوتی اور بہن کے متعلق فرمایا:

"لِلاِبْنَةِ النِّصْفُ، وَلِاِبْنَةِ ابْنٍ السُّدُسُ تَكْمِلَةَ الثُّلُثَيْنِ، وَمَا بَقِيَ فللأخت."

[بیٹی کو آدھا اور پوتی کو چھٹا حصہ ملے گا۔تاکہ ثلث کی تکمیل ہو جائے اور جو باقی بچے گا وہ بہن کو ملے گا۔][17]

اس حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں بیٹی کے لیے نصف اور پوتی کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ جب کہ اگر پاکستان کے مسلم عائلی قوانین ۱۹٦۱ء کی رو سے دیکھیں تو بیٹی کو ۱/۳ اور پوتی کو ۲/۳ دیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ اسلامی قانونِ وراثت سے انحراف ہے۔ اگر پہلے مرنے والے بیٹے کی بیٹی کو اس کے باپ کا حصہ دیتے ہیں تو پھر یہ قرآن کے متعین کردہ حصے سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ علما نے بھی اس کی مخالفت کی اور اسے غیر منصفانہ قرار دیا۔

حافظ احمد یار اپنے مقالے میں لکھتے ہیں کہ "حکومت پاکستان نے ۴ اگست ۱۹۵۵ء کو ایک "شادی اور عائلی قوانین کا کمیشن" مقرر کیا جسے مختصراً عائلی کمیشن کہا جاتا ہے۔ اس کمیشن کی اصل رپورٹ کا گزٹ نوٹیفیکیشن ۲۰ جون ۱۹۵٦ء کو آیا تھا۔ اور اس مسئلے پر مولانا احتشام الحق تھانوی کا اختلافی نوٹ کا گزٹ ۳۰ جون ۱۹۵٦ء کو آیا جس میں انھوں نے اس قانون سے اختلاف کیا اور متقدین فقہا کا موقف اختیار کیا۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے نتیجے میں جنرل ایوب خان ملک کے حکمران بنے اور ۱۹۵۹ء میں "اپوا" (انجمن بیگمات پاکستان) کی طرف سے عائلی کمیشن کی سفارشات کو قانوناً نافذ کرنے کے مطالبے پر ۲ مارچ ۱۹٦۱ء کو مسلم فیملی لاز آرڈی نینس کا صدارتی حکم جاری ہوا۔ اِس آرڈی نینس پر دو طرح کا ردِ عمل سامنے آیا۔ تجدید پسند حلقوں نے اس کی تائید اور حمایت کی۔ پنجاب کے ۱۴ علما کے ایک بورڈ نے (جس میں بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث اور شیعہ چاروں مکتبِ فکر کے علما شامل تھے) متفقہ طور پر آرڈی نینس کی دفعات نمبر ۷، ٦، ۵، ۴ اور ۱۲ کو خلاف شریعت قرار دیا جن میں دفعہ ۴ یتیم پوتے، پوتی کی وراثت سے متعلق تھی۔ مشرقی پاکستان کے علما نے بھی ان قوانین کے خلاف احتجاج کیا۔ ۱۹٦۲ء میں بھی مغربی پاکستان میں اس کے خلاف اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی گئی ۱۹٦۴ء اور ۱۹٦۷ء میں بھی اس پر بحث جاری رہی اور ۱۹٦۹ء میں بھی علما کی کونسل نے اپنا موقف

---

(17)– بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الفرائض: باب میراث ابْنَةِ الاِبْنِ مَعَ بِنْتٍ۔ حدیث نمبر ٦۷۳٦۔

حکومت کو بھجوایا۔ اس کے بعد تقریباً دس سال تک اس مسئلے پر خاموشی رہی اور یہ قانون بغیر کسی پیش رفت کے نافذ رہا۔"(18)

عائلی قوانین کے بارے میں (جن میں یتیم پوتے کی ورثت کا زیر بحث مسئلہ بھی شامل تھا) حکومت کے ایما پر کونسل نے اکتوبر ۱۹۶۴ء سے غور وخوض شروع کیا۔ جو مارچ ۱۹۶۷ء تک جاری رہا اور دسمبر ۱۹۶۷ میں کونسل نے اپنی سفارشات حکومت کو بھجوادیں۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۶۹ء میں (جب صدر ایوب خان کے خلاف تحریک شروع ہوگئی تھی) وزارت قانون کی طرف سے صدر پاکستان کے ایما پر کونسل کو دوبارہ ہدایت کی گئی کہ وہ عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۶ (جو مسئلہ تعدد ازواج سے متعلق ہے) پر دوبارہ غور کرکے رائے دے۔ کونسل نے اس سلسلے میں کاروائی مکمل کرکے ستمبر ۱۹۶۹ء میں اپنا جواب حکومت کو بھجوادیا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان (دونوں دفعہ کی) سفارشات میں کونسل نے خاص یتیم پوتے کی وراثت والی دفعہ نمبر (۴) کے معاملے میں کیا موقف اختیار کیا تھا۔ اس کے بعد تقریباً دس سال (جس میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا دور میں شامل تھا) اس مسئلے پر مکمل خاموشی رہی اور مزید کسی پیش رفت کے بغیر عائلی قوانین نافذ رہے۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق صاحب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر ملک پر مارشل لا کے ذریعے مسلط ہوگئے۔ انہوں نے ایوب خان اور یحٰیی خان کی طرح آئین مطلقاً منسوخ نہیں کیا اور بہت سے آئینی ادارے کام کرتے رہے۔ ان اداروں میں سے ایک "اسلامی نظریاتی کونسل" بھی تھی۔ ۱۵ نومبر ۱۹۷۸ء کو جنرل ضیاء الحق نے بطور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر "اسلامی نظریاتی کونسل" کو ہدایت کی کہ وہ تمام عائلی قوانین (جس میں یتیم پوتے کی رواثت کا مسئلہ بھی شامل تھا) کا از سر نو جائزہ لے کر رپورٹ پیش کرے۔ اس حکم نامہ کے مطابق کونسل نے ۲۹ جنوری ۱۹۷۹ء سے ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء تک غور وخوض کرنے کے بعد اپنی سفارشات ۳۰ اپریل ۱۹۷۹ کو حکومت کو پیش کردی۔ کونسل کی سفارشات وصول ہونے کے بعد وزارت قانون نے اپنے مراسلہ نمبر ۲۲۸۹/۷۹ مورخہ ۵ جنوری ۱۹۸۰ء کے ذریعے یہ سخت فیصلہ سنادیا (یا سفارش کردی) کہ عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء تمام کے تمام قرآن وسنت کے منافی ہیں لہذا ان کو مکمل طور پر منسوخ کر دینا چاہیے۔ مراسلہ کی عبارت یوں ہے:

---

(18)۔ حافظ احمد یار، **یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ**، (لاہور: ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، ۱۹۹۳)، ص ۱۲۲۔

"The Muslim Family Laws Ordinance of 1961 is utterly un-Islamic. It is against the Holy Qur'ān and *Sunnah*. It has dared to amend the Qur'ānic Law to the extent of IRTIDAD and its existence is a Slur, a Blot on the religion, the name of Islam and our Islamic country. Such legislation, or even its name, needs not be protected. Let us clean this blot altogether by its total REPEAL."(19)

[مسلم عائلی قوانین تمام کے تمام غیر اسلامی ہیں؛ یہ کتاب سنت کے منافی ہیں۔ان کے ذریعے **ارتداد** کی حد تک قرآنی قوانین میں ترمیم کی جسارت کی گئی ہے اور ان قوانین کا وجود مذہب اسلام اور ہمارے اسلامی ملک کے دامن پر ایک داغ اور ایک سّیاہ دھبہ ہیں۔ان قوانین کا نام ونشان بھی مٹادینا چاہیے اور ان کو مکمل منسوخ کر کے اس داغ کو صاف کر دینا چاہیے۔]

وزارت قانون کے اس مراسلہ پر اسلامی نظریات کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ کراچی (۱۷،۱۸ جون ۱۹۸۰ء) میں غور کیا ور یہ قرارداد منظور کی:

"اگرچہ اسلامی نظریاتی کونسل نے قبل ازیں مسلم عائلی قوانین میں ترامیم تجویز کی تھیں مگر وزارت امور مذہبی اور وزارت قانون دونوں کا خیال ہے کہ اس قانون کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ کونسل کو اس اقدام پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔تاہم کونسل کے تین اراکین بشمول خاتون رکن اس قانون کو مکمل طور پر ختم کرنے کی تجویز سے متفق نہیں ہیں اور وہ کونسل کی تجویز کردہ ترامیم کے حق میں ہیں۔"

اس کے بعد ۲۲ ستمبر ۱۹۸۱ء کو کونسل نے از خود یہ سفارش پیش کی کہ مسلم پرسنل لا (عائلی قوانین) کو بھی وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار (سماعت) میں شامل کر دیا جانا چاہیے کیونکہ کونسل کی سابقہ سفارشات پر بھی عملدرآمد نہیں ہو سکا۔(اور وزارت قانون کی سفارش یا فیصلے کو بھی نافذ یا قبول نہیں کیا گیا تھا)۔ اگر یہ قوانین اس عدالت کے دائرہ اختیار میں دے دیئے جائیں تو عدالتی فیصلوں کا نفاذ لازمی ہوگا۔ کونسل کی طرف سے یہ سفارش ۲۶ ستمبر ۱۹۸۲ میں غور کے بعد دی گئی تھی لیکن کابینہ نے کونسل کی اس سفارش کو منظور نہیں کیا۔اس طرح ایک مارشل لا کے نافذ کردہ اور دوسرے مارشل لا کے تحفظ دادہ یہ قوانین جوں کے توں نافذ رہے اور آج تک نافذ ہیں۔اگرچہ اس کے بعد بھی بعض دینی حلقوں کی طرف وقتاً فوقتاً ان قوانین کو منسوخ کرنے یا کم از کم ان کو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار میں لانے کا مطالبہ کیا جاتا رہا لیکن جنرل ضیاء الحق صاحب نے پہلے

(19)۔ سید افضل حیدر، **اسلامی نظریاتی کونسل** (اسلام آباد: دوست پبلیکشنز، ۲۰۰۶ء)، ص ۵۲۲۔

جرنیلوں اور غیر جرنیل حکمرانوں کی بہ نسبت مزید پکا کام کر کے عائلی قوانین کو آئینی تحفظ دے دیا کہ اب آئین میں ترمیم کئے بغیر ان کے بارے میں کوئی مطالبات تسلیم نہیں کئے جا سکتے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ تعجب خیز بلکہ ناقابل فہم سی بات یہ ہے کہ جب وزارت قانون نے ۱۵ جنوری ۱۹۸۰ء کو ان قوانین کو ارتداد کی حد تک قرآن میں تحریف، خلاف کتاب و سنت اور اسلام کے روشن چہرے پر ایک سیاہ دھبہ قرار دے دیا تھا تو سرکاری سطح پر اس فیصلے کے باوجود ان قوانین کو کالعدم کیوں نہ کر دیا گیا۔ جب کہ اسلامی نظریاتی کونسل اس فیصلہ پر صاد کر چکی تھی۔ ان عوامل و محرکات کا کچھ پتہ نہیں چلتا جو آخری مرحلے پر مانع ثابت ہوئے۔ حالانکہ بظاہر جنرل ضیاء الحق کے دور میں یہ کام بآسانی سر انجام پا سکتا تھا یا کم از کم نظریاتی کونسل کی ترامیم ہی قبول کی جا سکتی تھیں۔ ایسا کیوں نہ ہوا؟ اسلامی نظریاتی کونسل کے اس وقت چیئرمین جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب نے اس پر یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت غالباً خواتین کے ایک طبقہ کی طرف سے مخالفت کے اندیشہ کے پیش نظر مسلم عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء (جن کی دفعہ نمبر ۴ یتیم پوتے سے متعلق ہے) کے بارے میں کونسل یا وزارت قانون کی سفارشات پر عمل پیرا نہ ہو سکی۔"(20)

"فقہی نقطہ نظر سے اگر مسلم عائلی قوانین کی دفعہ ۴ کا جائزہ لیا جائے تو سب زیادہ عجیب بات یہ کہ یہ قرآن کریم کے بنیادی چھ وارثوں (ماں، باپ، بیوی، خاوند، بیٹی، بیٹا) میں حق وراثت میاں بیوی سے بلکہ عملاً والدین سے بھی چھین لیتی ہے۔ بلکہ حق وراثت کو صرف نسبی رشتہ داروں (بیٹا بیٹی) تک محدود کر دیا (کیونکہ قائم مقامی صرف اسی صورت میں چل سکتی ہے)۔ یہ قرآن حکیم کے قانون وراثت بلکہ اصولِ وراثت ہی سے صریح مخالفت ہے۔ قرآن کریم میں تو ہے کہ ﴿مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ﴾(21) کہ ورثت ماں باپ سے بھی ملے گی اور بعض دوسرے "الأقربون" قریبی رشتہ داروں (مثلاً بیوی خاوند بیٹا، بیٹی) سے بھی۔۔۔ "**طلوع اسلام**" کی نسبی رشتہ داروں والی تجویز (اور پھر اسی پر مبنی عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴) کے مطابق تع وراثت دینے کا حق صرف والدین کی طرف سے تسلیم کیا گیا ہے۔ "الأقربون" (جن میں خاوند اور بیوی لازماً شامل ہیں) سے وراثت

---

(20)۔ احمد یار، **یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ**، ص ۱۲۸۔
(21)۔ القرآن، ۴: ۷۔

پانے کے قرآنی حق کا ہی انکار کر دیا گیا ہے۔ ''قرآنی فکر'' کی یہ کون سی قسم ہے![22] میاں بیوی کا وراثت میں حصہ تو قرآن کریم کا اتنا واضح حکم ہے کہ اس کو ترک کرنے کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی اس لئے اہل سنت زوجین کو ذوی الفروض میں رکھ کر سب سے پہلے ان کا حصہ نکالتے ہیں۔ اور اس لئے فقہ جعفری میں زوجین کو طبقات ورثا سے الگ رکھا گیا ہے کہ زوجین ہر طبقہ کے ساتھ وراثت پائیں گے وہ کبھی محجوب نہیں ہو سکتے۔

وراثت کو نسبی رشتہ داروں تک محدود کرنا اور مرنے والے کی بیوہ کو بھی اس سے محروم کرنا تو ایک لحاظ سے ہندو رواجی قانون وراثت سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ ہندو قانون کے مطابق بھی بیوہ (خاوند کی اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں) ''تاحیات'' اپنے مرنے والے خاوند کی جائیداد کی مالک متصور ہوتی ہے البتہ وہ اسے کہیں منتقل نہیں کر سکتی۔ باقی تصرفات (ٹھیکہ، کرایہ، مزارعت وغیرہ) کا اس کو حق ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد وہی جائداد اس کے مرنے والے خاوند کے ''نسبی رشتہ داروں'' کی طرف لوٹ آتی ہے۔ ہندوؤں میں چونکہ بیوہ دوبارہ شادی نہیں کر سکتی اس لئے ان کے ہاں بیوہ کا یہ حق ''تاحیات'' قید کے ساتھ مقید ہے۔ مسلمانوں کے جن علاقوں میں انگریزوں نے رواجی ہندوانہ قانون اپنانے کی اجازت دے دی تھی (یا جہاں خود مسلمانوں نے شریعت کے مقابلے پر رواجی (ہندو) قانون کو ترجیح دے کر اختیار کیا تھا) وہاں بھی مسلمان بیوہ (خاوند کی اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں)''نکاح ثانی'' اپنے مرحوم خاوند کی جائیداد کی مالک اور بیع وانتقال کے سوا تمام تصرفات کی حقدار سمجھی جاتی تھی۔ خیال رہے کہ قرآن کریم کے مطابق تو بے اولاد بیوہ بھی اپنے خاوند سے وراثت کی لازماً حقدار ہے۔''[23]

امریکہ میں (بہت سے یورپی ممالک کی طرح) الگ قانون وراثت نہیں ہے بلکہ یہ مورث کی وصیت پر منحصر ہے۔ وہاں اگر کوئی آدمی بغیر وصیت کئے مر جائے تو حکومت ہی اس کی ساری جائیداد کی وارث ہوتی ہے۔ البتہ حکومت کے قبضہ کر لینے کے بعد مرنے والے کی صرف بیوہ (جس کے حق میں وصیت بھی نہیں ہو سکی تھی) اپنا کچھ حصہ حکومت سے طلب کر سکتی ہے اور اسے کچھ نہ کچھ مل بھی جاتا ہے مگر مرنے والے کا دوسرا کوئی عزیز (اولاد بھی) وصیت کے بغیر حکومت سے کچھ نہیں لے سکتا۔

---

(22)۔ ایضاً، ص۱۲۹۔
(23)۔ ایضاً، ص۱۳۶۔

دنیا کا کوئی غیر مسلم (یہودی عیسائی وغیرہ) عربی دان بھی قرآن کریم کا مطالعہ کرے تو وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ "یہ کتاب بیک وقت والدین، زوجین اور اولاد (بیٹا بیٹی) کو لازماً وارث بناتی ہے اور اس میں سے کسی ایک کو بھی (بوقت تقسیم وراثت زندہ ہوتے ہوئے) کسی طرح محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی نظیر ادیانِ عالم اور انسانی (وضعی) قوانین میں کہیں نہیں ملتی۔" اس اس لئے Von Kremer نے اسلامی قانون وراثت کو اسلامی قوانین کی "Supremely Original Branch" قرار دیا تھا۔ اور حالت یہ ہے کہ خود "مفکرینِ قرآن" اس عظیم و بے مثل قانون کی اسی "Originality" کو ختم کر کے اسے ہندوانہ رواجی قانون کی سطح پر لے آنے پر آمادہ ہو گئے۔ (صرف اس فرق کے ساتھ کہ نسبی رشتہ داروں میں بیٹا بیٹی دونوں کو (قرآن کے مطابق) شامل کر لیا جائے جب کہ ہندو قانون میں صرف بیٹا وراثت پاتا ہے بیٹی نہیں)۔ کیا قرآنی قانون وراثت بس اتنا ہی ہے کہ بیٹے کے ساتھ بیٹی بھی حصہ لے گی۔ آگے والدین اور زوجین کا ذکر ہی نہیں ہے؟ اور پھر قرآن کریم کے اس قانون وراثت میں جس میں وراثت پانچ طرف سے کسی کے پاس آسکتی ہے اور پھر صاحب جائیداد کے مرتے ہی پانچ مختلف سمتوں میں روانہ ہو جاتی ہے۔

اس قانون میں گردش زر کا جو اصول ہے اور انسانی معاشرے میں جو معاشی مصالح اس سے وابستہ ہیں اسے یہ "نظام ربوبیت" کا نعرہ لگانے والے بھی نہ سمجھ سکے یا محض "بغیا بینهم" کے ماتحت ہر چیز سے آنکھیں بند کر لی۔ جب دیکھا کہ قرآنی قانون وراثت میں تو اصول قائم مقامی کسی طرح چل ہی نہیں سکتا تو ہندوؤں کی طرح (یا دوسرے مذاہب کی طرح) صرف "نسبی رشتہ داروں" (یعنی صرف اولاد) کے حق وراثت کے نمائندہ بن بیٹھے۔ کیونکہ صرف اسی میں قائم مقامی چل سکتی ہے۔ کیا یہ اسی طرح کی سنگدلی نہیں جس کے ماتحت ہمارے جاہل مسلمانوں کو بوڑھی سوتیلی ماں کو یا جوان بے اولاد بیوہ بھاوج کو (جسے نکاح ثانی کا حق بھی دیا گیا ہے) قرآنی قانون کے مطابق وراثت میں حصہ دینا خلاف عقل اور باعث فساد نظر آتا ہے۔(24)

حافظ احمد یار اپنے مقالے میں عائلی قوانین کی دفعہ ۴ کا قرآن و سنت کی واشنی میں جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

(24)۔ ایضاً، ص ۱۳۸۔

(ا) ''اس میں بھی پہلی خلاف قرآن بات تو یہی ہے کہ قرآن کریم کے مقررہ کردہ چھ بنیادی وارثوں (والدین ،زوجین اور بیٹا بیٹی) میں سے صرف دو(یعنی مرنے والے بیٹے یا بیٹی) کے لئے حق جانشینی (یا قائم مقامی) تسلیم کیا گیا ہے۔آخر مرنے والے خاوند، مرنے والی بیوی یا مرنے والے ماں اور باپ کا حصہ کیوں نہ نکالا جائے اور پھر آگے ان کے ممکنہ وراثوں میں تقسیم کیا جائے ؟اسی سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے قانون وراثت میں نیابت یا قائم مقامی نہیں چل سکتی۔

(ا) پھر اس میں دوسری خلاف قرآن بات یہ ہے کہ مرنے والے بیٹے یا بیٹی (بیٹوں بیٹیوں) کا حصہ نکال کر آگے ان کے قرآنی وارثوں کی بجائے صرف ان کے بیٹوں بیٹیوں ہی میں تقسیم کیا گیا ہے۔آخر مرنے والی بیوی کے خاوند یا مرنے والے خاوند کی بیوہ کو آپ قرآن کے کس حکم کے تحت وراثت سے محروم کر سکتے ہیں۔

یہاں ایک اور بات ضمناً سامنے آتی ہے کہ عائلی قوانین کی اس دفعہ نمبر ۴ میں اگرچہ صراحت کے ساتھ یہ نہیں کہا گیا کہ مرنے والے کی بیوہ/والی کے خاوند کو میراث سے محروم کر دیا جائے گا۔ تاہم قانون سازی میں اولاد (بیٹا یا بیٹی) کے الفاظ کا لازمی نتیجہ یہی نکلا کہ جب اعلیٰ عدالتوں میں اس قانون کی عملی تعبیر و تشریح کا وقت آیا تو یہ معاملہ صاف ہو گیا کہ مورث کی وفات سے قبل فوت ہو جانے والے پسران اور دختران کی اولاد کو اپنے باپ یا ماں کا حصہ بحصہ رسدی ملتا ہے۔ایسے فوت شدہ پسران یا دختران کی بیوہ یا شوہر کو اس حصے سے کچھ نہیں ملے گا۔''(25)

''غالباً کسی مرنے والے کی بیوہ نے (یا مرنے والی کے شوہر) نے اس پر بنا پر اپنا شرعی حق مانگا ہو گا کہ آخر میں جس کا حصہ تقسیم کے لئے نکالا جا رہا ہے اس میں اس کا بھی حصہ بنتا ہے مگر عدالت مجبور تھی کہ قانون کے الفاظ (*Litra Legis*) کے حق کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ یہ صرف ان کے نسبی وارثوں یعنی اولاد تک ہی محدود ہیں۔ عدالتوں کے ان فیصلوں میں ان لوگوں کے لئے بھی جواب موجود ہے جو یتیم پوتے کے مجوب الارث ہونے پر قرآن کے کسی صریح حکم (نص) کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بعض قانونی احکام کے لئے نص صریح نہیں ہوتی مگر وہ نص صریح پر عمل کرنے یا اس کو نافذ کرنے کا صریح اقتضا (Corollary) ہوتے ہیں۔ اور آخر پر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ

(25)– PLD 1975 Peshawar 71, اور PLD 1978 Lahore 483.

عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ کے ذریعے کی گئی اس قانون سازی نے ملک کے کتنے یتیموں کا مسئلہ (یا مسائل) حل کر دیئے ہیں؟ اس طرح دادا کی وراثت سے حصہ لینے والے یتیم تو شاید پورے ملک میں چند ہزار بھی بمشکل ہوں گئے۔

کیا باقی یتیموں کے بارے میں قرآن کریم خاموش ہے؟ پاکستان میں حکومتی سطح پر ملک بھر کے یتامی کے مسائل کے لئے قرآنی احکام کے مطابق قانون وصیت اور قانون نفقات (کفالت) کے نفاذ کے ذریعے قانون سازی کی جانی چاہیے۔ جس میں ہر طرح کے یتیموں کے علاوہ دوسرے محتاج مگر غیر وارث رشتہ داروں (بیوہ، بہنوں، مفلس بھائیوں وغیرہ) اور غیر رشتہ داروں کے مسائل کے حل کی بھی گنجائش موجودہ ہو۔ حکومتی سطح پر اس مسئلہ کا حل بذریعہ قانون سازی کے حوالے سے یہاں بطور تقابل یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا کہ یہی مسئلہ (محجوب الارث یتیم پوتے وغیرہ کا) حل کرنے کے لئے حکومت مصر نے بھی قانون سازی کی ہے اور حکومت پاکستان نے بھی۔ حکومت مصر نے اس کا علاج ''وصية واجبة'' کا قانون نافذ کر کے کیا ہے۔ چونکہ وہاں عام قانون وصیت بھی نافذ ہے اور دادا اپنی زندگی میں ایسے یتیم پوتوں، نواسوں وغیرہ کے لئے وصیت کر سکتا ہے جو بعد میں قانوناً نافذ ہو گی۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی میں بطور ھبہ بھی دے سکتا ہے۔ اس لئے مصری قانون ''وصیت واجبہ'' صرف ایسے محجوب الارث پوتوں نواسوں وغیرہ (اولاد الاولاد) کے لئے ہیں جن کو دادا یا نانا نے اپنی زندگی میں نہ تو کوئی چیز بطور ھبہ دی ہو اور وصیت بھی نہ کر سکا ہو جس کی وجہ سے وہ عام قانون وصیت سے فائدہ نہ اٹھا سکتے ہوں (جیسے امریکی قانون میں وہ بیوی جس کے لئے خاوند کو وصیت کا موقع نہ ملا)۔ ایسے پوتوں، پوتیوں، نواسوں اور نواسیوں کے لئے مورث کے کل ترکہ کے ۱/۳ حصہ میں سے (جو سنت کے مطابق وصیت کی حد ہے) بذریعہ سول عدالت بطور وصیت واجبہ حصہ ملنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ مصری حکومت کا یہ قانون قرآن و سنت سے قریب تر ہے۔''(26)

اس کے برعکس پاکستان میں چونکہ محجوب الارث کو مورث کی وصیت سے متمتع ہونے کا بذریعہ قانون موقع ہی نہیں دیا گیا؛ اس لئے یہاں اس مقصد (محجوب الارث کو کچھ دلانے) کے لئے اسلام کے قانون وراثت میں ہی تبدیلی کر دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قانون شروع ہی سے تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے۔ یہاں ایسی تمام اولاد الاولاد کو جو بوقت تقسیم وراثت زندہ موجودہ ہوں (چاہے دادا نانا ان کو

(26)۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔

اپنی زندگی میں بھی کچھ دے گیا ہو) سب کے لئے ''وراثت'' پاسکنے کے لئے قانون سازی کی گئی ہے۔ (مصری قانون میں یہ شرط مذکور ہے جب کہ ہمارا قانون بالکل خاموش ہے)۔ اس مسئلہ میں حکومت مصر کا قانونی حل پاکستانی قانون کے مقابلے میں قرآن وسنت سے قریب تر اور اسلامی ہے۔

مسلم عائلی قوانین کی دفعہ ۴ کے بارے میں شرعی نقطہ نظر معلوم کرنے کے لیے یہ مسئلہ اسلامی نظریاتی کونسل کو بھیجا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں کونسل نے یہ موقف قائم کیا کہ یہ بچے (پوتے) ازروئے شریعت ایسی حالت میں وارث نہیں ہیں اور نہ جبری وصیت کے ہی ذریعے ان کا انتظام کیا جائے گا۔ بلکہ ان کے حالات کو جانچنے کے لیے بعد کے ورثا سے حسب تقاضاے شریعت ان کے نان ونفقہ کا انتظام بذریعہ عدالت کرایا جائے۔ کونسل کے دو اراکین نے اس وقت کونسل کے اس موقف کی مخالفت کی تھی۔ ان میں سے ایک رکن ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب نے آرڈیننس کی دفعہ ۴ کو مکمل طور پر درست قرار دیا تھا۔ جب کہ دوسرے رکن جناب ابوالہاشم صاحب نے یہ کہا تھا کہ یہ بچے اپنے ماں باپ کے حصے کے وارث ہیں۔ لیکن اگر دادا کی کوئی اولاد زندہ ہو تو اس موقع پر اصول نمائندگی بروئے کار نہیں آئے گا، بلکہ فی کس (Per Capita) حصہ لیں گے۔(27)

۱۹۶۹ء میں وزارت قانون و پارلیمانی امور کی درخواست پر کونسل نے ایک مرتبہ پھر اس مسئلے پر غور کیا اور اپنے موقف کا اعادہ کیا۔ ۱۹۷۹ء میں صدر جنرل ضیاء الحق کی ہدایت پر ایک بار پھر یہی مسئلہ کونسل کے زیر غور آیا اور کونسل نے دفعہ ۴ میں پوتے کے لیے وصیت کی سفارش کی۔ یعنی اگر مورث کی زندگی میں اس کا کوئی لڑکا یا لڑکی فوت ہو جائے تو کسی اور لڑکے کی موجودگی کی صورت میں یتیم پوتے اور پوتی کو دادا کی وصیت کے مطابق حصہ ملے گا۔ بشرطیکہ وہ وصیت ایک تہائی سے زائد نہ ہو۔ اور اگر دادا نے وصیت نہ کی ہو تو ورثا پر لازم ہو گا کہ وہ عائلی عدالت کی طرف سے مقرر کردہ نفقہ انہیں ادا کریں۔(28) موجودہ دور میں میں صورتحال اس فقہی حل کے موافق نہیں اور یہ رائے قابل عمل بھی نہیں بلکہ اس مسئلے میں مزید غور وفکر کی ضرورت تھی۔ **مجموعہ قوانین اسلام** میں ڈاکٹر تنزیل الرحمن نے کی رائے کافی متوازن اور قابل عمل نظر آتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہی قانون سازی کی جائے جس کے ذریعے دادا پر لازم ہو کہ وہ اپنے یتیم پوتے پوتیوں کے حق میں وصیت کرے، اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ کسی تیسرے ادارے کے حق میں وصیت کرتا ہے تو عدالت اسے

---

(27)— **رپورٹ مسلم عائلی قوانین**، اسلام آباد، اسلامی نظریاتی کونسل، اکتوبر، ۱۹۹۳، ص ۹۔

(28)— ایضاً، ص ۲۹۔

ضرورت مند پوتے پوتیوں کی طرف لوٹادے اور اگر دادا خاموشی اختیار کرے اور کوئی بھی وصیت نہ کرے تو عدالت دادا کے وصی کا کردار ادا کرے گی اور یہ فرض کرے گی کہ دادا نے ایک تہائی کی حد تک یتیم پوتوں کے حق میں وصیت کی ہے۔ تاہم اگر دادا نے تحریری طور پر ان افراد کے حق میں وصیت سے انکار کر دیا ہو تو اس صورت میں وصیت واجبہ کا اصول لاگو ہو گا۔ (29)

۱۹۸۰ء میں قائم کی جانے والی وفاقی شرعی عدالت نے اجتماعی اجتہاد کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک تاریخی فیصلہ دیا جس میں یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے کو موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں ''وصیت واجبہ'' کے اصول کو متعارف کرایا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں جب کوئی چچا یا پھوپھی اپنے بھتیجوں کا حق دینے کے لیے تیار نہیں اور عدالتوں کے ذریعے انہیں نفقہ دلانا بھی تقریباً ناممکن ہے تو ''وصیت واجبہ'' ہی اس مسئلے کا بہترین حل ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر دادا خود کوئی وصیت نہیں کرتا، یا انہیں کوئی حصہ ہبہ نہیں کرتا تو ایک تہائی کی حد تک وصیت سمجھتے ہوئے یتیم پوتوں کو ترکے میں سے حصہ دیا جائے گا، اس میں شرط یہ ہے کہ والد کے زندہ ہونے کی صورت میں جو ترکہ انہیں ملنا تھا، وصیت کے ترکے کی مقدار اس سے زیادہ نہ ہو، گویا دونوں میں سے کم تر مقدار والا ترکہ انہیں دیا جائے گا۔ اس ضمن میں عدالت نے مصر کے عائلی قوانین سے بھی رہنمائی لی ہے۔ (30)

وفاقی شرعی عدالت اور ڈاکٹر تنزیل الرحمن صاحب کی آرا کو اگر جمع کیا جائے تو بہترین اجتہادی حل سامنے آ جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر یتیم پوتے کے حق میں دادا وصیت کر دے، یا ہبہ کر دے تو درست، اور اگر ایسا نہ کیا گیا ہو تو ترکے میں سے ایک تہائی کی حد تک اسے وصیت سمجھا جائے۔ اس وصیت کو حسب ضرورت ایک تہائی سے کم بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر یتیم پوتوں کے حصے میں اپنے چچاؤں، یعنی دادا کے حقیقی وارثوں سے زیادہ مقدار میں وراثت منتقل ہو رہی ہو تو اسے اس حد تک کم کر دیا جائے کہ ان کے والد کے زندہ ہونے کی صورت میں جو ترکہ انہیں حاصل ہوتا وہ مل جائے۔

نتائجِ تحقیق

(29)– **اجتماعی اجتہاد**، ص ۲۹۶۔

(30)– PLD Supreme Court 2000 FSC 1.

پاکستان میں قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے میں اسلامی نظریاتی کونسل نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ قیامِ پاکستان سے لیکر ۱۹۷۹ء کے عرصے تک قوانین کے نفاذ کے ضمن میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی، لیکن اس کے بعد حدود آرڈیننس کے نفاذ سے شروع ہونے والے سلسلے میں متعدد قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالا گیا۔ مثلاً زکوۃ وعشر کا نظام، ملک سے سود کے خاتمے کے لیے حکومت کے احکامات، قصاص ودیت آرڈیننس، قانون عدلیہ اور اقتصاد کے اسلامی نظام کے لیے کارکن تیار کرنے کی خاطر پہلے شریعہ فیکلٹی اور پھر اسلامی یونیورسٹی کا قیام، شریعت بینچوں اور پھر وفاقی شرعی عدالت کا قیام جیسے اہم اقدامات شامل ہیں۔اس کے علاوہ دفاتر میں نماز ظہر کا اہتمام، ماہِ رمضان کے احترام میں سینما ہالوں کی تالہ بندی، عورتوں کے لیے علیحدہ یونیورسٹیوں کا قیام، پاکستان میں گریجویشن کی سطح تک اسلامیات کی بطور لازمی مضمون شمولیت، محتسب اعلیٰ کے منصب کا اجرا، ذرائع ابلاغ پر فحش پروگراموں پر مکمل پابندی بھی اسلامی نظریاتی کونسل کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ البتہ حالیہ ادوار میں کونسل تمام مکاتب فکر اور عالم اسلام کے تمام فقہا کی رائے کو مکمل اہمیت دیتے ہوئے مسائل کے استنباط کی طرف بڑھ رہی ہے۔اس طرح کے تمام تحفظات کے باوجود اسلامی نظریاتی کونسل اجتماعی اجتہاد کا ایک بہترین اور موثر ادارہ ہے۔ کونسل کی سفارشات پر پاکستان میں بعض ایسے قوانین کا نفاذ ہوا جو اس ریاست کی نظریاتی سمت متعین کرنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کونسل کی آرا کی ثقاہت اور استنادی حیثیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان سفارشات کو نہ صرف اندرونِ ملک سراہا گیا، بلکہ عالم اسلام میں بھی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے دوسرے قوانین کی طرح مسلم عائلی قوانین پر بھی غور وفکر کر کے اس میں خلافِ اسلام دفعات کو حذف یا تبدیل کرنے کی سفارشات کی ہیں۔ اس ضمن میں پاکستان میں رائج مسلم عائلی قوانین آرڈیننس ۱۹۶۱ء کا دفعہ وار جائزہ لے کر اس میں ترمیم کی تجویز کی گئی ہیں۔ وراثت کے قوانین، بالخصوص یتیم پوتے وپوتی کی میراث کا مسئلہ اور کئی اہم سے متعلق بھی اسلامی نظریاتی کونسل نے سفارشات پیش کی ہیں۔

****